راجندر سنگھ بیدی کی تخلیقات میں معاصر معاشرت کی بازیافت: ایک محاکمہ

ڈاکٹر نقیب احمد جانؔ ☆
Dr. Naqeeb Ahmad Jan
ڈاکٹر منزہ مبین ☆☆
Dr. Munaza Mubeen

Abstract:

Human society has number of customs, traditions and norms which affect every individual in a unique and different way. These customs and traditions are not totally beneficial nor detrimental in its original shape, but the circumstances make them the one or the other. These effects are faced and felt by each individual but Poets or writers being the most sensitive people of the society feel them seriously and they raise their voices against the tragedies faced by human beings in society through their imaginative works. Rajinder Singh Bidi is a famous Urdu Short Story writer and his stories contain all the resumptions of the society the human lives and behaviours. This article sheds light on the voices of Bidi against those social norms which are harmful to human beings.

Key Words:

Rajinder Singh Bidi, Society, Humanity, Traditions, Customs

کلیدی الفاظ:

راجندر سنگھ بیدی، معاشرہ، انسانیت، معاشرتی اقدار، روایات

انسانی معاشرہ انسانی جذبات، احساسات، آرزوؤں، تمناؤں اور رویوں کی آماجگاہ ہوتا ہے۔ معاشرے میں رہنے والے ہر فرد پر لاشعوری اور شعوری طور پر اس کا معاشرہ اثر انداز ہوتا رہتا ہے اور بہ طورِ ردِّ عمل اپنے رویوں، احساسات اور اعمال و افعال کی شکل میں معاشرے پر اپنا اثر ڈالتا رہتا ہے۔ ہر معاشرے کا اپنا طرزِ عمل ہوتا ہے اور اسی طرزِ عمل کے زیرِ اثر اس کے اقدار و

☆ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، ویمن یونیورسٹی، صوابی
☆☆ صدرِ شعبۂ اردو، ویمن یونیورسٹی، صوابی

روایات اور رسوم و رواج مل کر اس معاشرے اور اس کے افراد کے اجتماعی و انفرادی طرزِ عمل کی ساخت و تشکیل کرتے ہیں۔ معاشرے کے قیود و رسوم مکمل طور پر سود مند بھی نہیں ہو سکتے اور کلی طور پر ضرر رساں بھی نہیں۔ ایک ہی رسم بیک وقت معاشرے کے کچھ افراد کے لیے باعثِ ضرر ہوتی ہے اور عین اسی لمحے اس رسم سے دوسرے افراد فوائد حاصل کر رہے ہوتے ہیں۔ اس تفاوت اور مفادات کی بو قلمونی کا پیڑ عین فطری اصولوں کی جڑوں پر استوار ہوتا ہے۔ کیونکہ کوئی بھی عمل کوئی بھی کام بیک وقت معاشرے کے تمام افراد کے لیے پسندیدہ یا ناپسندیدہ نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ انسانی فطرت، احساسات و محسوسات ، رویوں، اندازِ فکر ، طرزِ عمل اور مفادات کی رنگا رنگی اور بو قلمونی کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔

وقت کا بے رحم پہیہ گھومتا رہتا ہے۔ زمانے کے چکر میں توقف نہیں آتا ہے۔ معاشرہ اسی گردش اور چکر کے ساتھ ساتھ چلتا رہتا ہے۔ یہ چکر کسی کو رفعتوں اور بلندیوں پر پہنچاتا ہے اور اسی چکر کے نتیجے میں کوئی پاتال میں جا گرتا ہے۔ اس گردش کے متاثرین نباتات، جمادات و حیوانات کے ساتھ ساتھ معاشرے کے رسوم و رواج اور اقدار و روایات بھی ہوتے ہیں لیکن اس گردش کا ناظر و شاہد اشرف المخلوقات یعنی انسان ہے۔ انسانوں میں بھی صرف وہ انسان جو کالانعام نہیں ہوتے بلکہ وہ ہوتے ہیں جن کی بصیرت کی آنکھیں روشن ہوتی ہیں۔ علماء و مفکرین اور ادیب و شاعر ہر معاشرے کے ایسے صاحبانِ بصیرت لوگ ہوتے ہیں جو معاشرے کے لیے دیدۂ بینا کا کام سر انجام دے رہے ہوتے ہیں اور پھر ان میں اپنے زیرک مشاہدے، حساس دل اور بے لاگ زبانِ اظہار کے مالک ادیب و شاعر معاشرے کے ہر طرزِ عمل کے شارح و مفسر ہونے کے ساتھ ساتھ ناقد و مبصر بھی ہوتے ہیں۔ اپنے معاصر معاشرے کی خوبیوں اور خامیوں کو افرادِ معاشرہ کے لیے کھول کر رکھنا ہر دور میں شعرا و ادبا نے لاشعوری طور پر اپنا فرض سمجھا ہوا ہے اور اس کا بے لاگ اظہار ان کی تخلیقات و تصنیفات میں نظر آتا ہے۔ راجندر سنگھ بیدی نے ہندوستان کے نو آبادیاتی معاشرے میں آنکھ کھولی، سیالکوٹ، لاہور اور ممبئی اس کی اقامت گاہیں رہیں تھیں۔ یعنی انگریزی راج کے زیرِ اثر ہندوستانی معاشرے کے علاوہ آزاد ہندوستانی و پاکستانی معاشرہ اس کے مشاہدات کی جولاں گاہ رہا ہے۔ اس معاشرے کو اور اس کی قدروں کا اس نے کس نظر مشاہدہ کیا ہے اور ان قدروں کا اس کی ذات پر کیا اثر ہے اور اس نے اپنی تخلیقات میں کس طرح سے ان کو پیشکش کیا ہے، اس مقالے میں اجمالی طور پر یہ امور زیرِ بحث لائے جا رہے ہیں۔

معاشرے کے بغیر انسانی زندگی کا تصور بے معنی سا لگتا ہے۔ معاشرہ انسان کو ہر لحظہ نت نئے طریقوں سے متاثر کرتا رہتا ہے۔ جیسے جیسے مختلف معاشروں میں ان کی اقدار و روایات کو سامنے رکھتے ہوائے ان کی تہذیب و ثقافت میں تغیرات رونما ہوتے ہیں ویسے ہی انسانی زندگی میں تبدیلیاں سامنے آنے لگتی ہیں۔ رفتہ رفتہ یہی تبدیلیاں ادب میں مختلف النوع صورتوں میں در آنے لگتی ہیں، کیونکہ ادب کا معاشرے سے گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ کوئی بھی ادیب اپنے معاشرے اور اس کے اندر رونما ہونے والے واقعات، حادثات، تبدیلیوں اور اقدار و روایات کے ساتھ ساتھ پورے سماجی ڈھانچے میں رونما ہونے والی تغیرات سے متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکتا۔ راجندر سنگھ بیدی کا شمار بھی ایسے ہی ادیبوں میں ہوتا ہے جو اپنی تخلیقات میں مذہبی، سیاسی و سماجی اور تہذیبی و معاشرتی حقائق کی پیشکش کو اولین فرض سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر انوار احمد بیدی کے فکشن کے کے بارے میں اپنی رائے اس طرح سے دیتے ہیں کہ

> ”پریم چند کے بعد اردو افسانے کو فکر و فن کی وسیع تر کائنات سے جوڑنے والوں میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ وہ بھی تلخی سے سماجی امتیازات کا ذکر کرتا ہے۔ اس کے ہاں بھی غریب اپنی اُکھڑی ہوئی سانسوں کو بھی گروی رکھنے کی فکر میں مبتلا ملتے ہیں۔ بیدی کے ہاں بھی بوڑھے، بیمار اور کمزور کسمپرسی کے عالم میں جان دیتے ہیں۔ افلاس چہروں کو ہی نہیں روح کو بھی مسخ کر دیتا ہے۔ اور اس اندھیرے میں خلوص کا چہرہ پہچانا نہیں جاتا۔ مگر حقیقت میں بیدی کے ان افسانوں میں بھی وہ نفسی رمزیت موجود ہے جو بعد کو بیدی کی سب سے بڑی شناخت بنی۔ وہ انسانی رشتوں اور رویوں کے بطن سے جھانکتا دکھائی دیتا ہے۔“[1]

اس طرح بیدی کا فکشن اور اس کے وضع کردہ کردار کسی سماج اور اس سماج کے معاشرتی ڈھانچے کی مختلف پرتوں کے عکاس بنتے ہیں۔ اس طرح وہ ایک ماہر سماجیات کی شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کے ہاں عموماً حقیقت کا سطحی روپ نہیں بلکہ اس کا نفسی اور تہذیبی جوہر منکشف ہوتا ہے۔ بیدی کا تخلیقی ذہن داستانوی فضا بنانے، کرداروں کی نفسی ساخت و تشکیل، ثقافتی و تہذیبی شخصیت پر توجہ دینے اور زندگی سے بھرپور مکالمے لکھنے میں اپنی مثال آپ ہے، مثلاً افسانہ ”بھولا“ میں بھولا ایک یتیم بچہ ہے۔ ”مایا“ ایک نوجوان بیوہ اور "متکلم" ایک ایسا بوڑھا جس کا جوان بیٹا مر چکا ہے۔ اس کے باوجود کہانی کی فضا افسردہ نہیں، بھولا کی معصومیت، مایا کی ممتا اور گھر کی دیکھ بھال اور بابا کا دونوں سے پیار، خوشحال زندگی گزارنے کے آرزومندوں کے لئے

مثالی گھر کا تصور پیش کرتا ہے۔ ہندوستانی معاشرے میں بیوہ کو وہ سہولیات اور وہ مقام نہیں دیا جاتا جو عموماً کسی سہاگن کو دیا جاتا ہے۔ ہندوستانی سماج میں بیوہ منحوس سمجھی جاتی ہے اور اس حد تک کہ بیوہ اپنی آئندہ بیوگی کی زندگی کا تصور کرتے ہوئے اپنے شوہر کے ساتھ اس کی چتا میں زندہ جلنے کو ترجیح دیتی تھی۔ بہت صورتوں میں یہ ایک ظالمانہ رسم اور مذہبی رسم سہی لیکن بہت دفعہ بیوگی میں زندگی گزارنے والی عورتوں کی حالت زار کا مشاہدہ کرنے والی خواتین جو خود بیوہ ہو جاتی ہیں تو بیوگی کی ذلالت میں زندگی گزارنے مرے ہوئے شوہر کے ساتھ زندہ جلنے کی تکلیف دہ موت کو ترجیح دیتے ہوئے راضی خوشی موت کو گلے لگا لیتی تھی۔ امیر خسرو اس تصور کو کسی اور نظر سے دیکھتے ہوئے کہتے ہیں:

خسروا درر عشق بازی کم زہندو زن مباش
کز برائے مردہ سوزد زندہ جانِ خویش را[۲]

لیکن بیدی اس تصور کے حامی نہیں ہیں۔ وہ ہندو بیوہ عورتوں کے ساتھ ہونے والے سلوک سے نالاں ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ بیوہ ہونے میں عورت کا کوئی قصور تو ہے نہیں، لہٰذا اس کو معاشرے میں باعزت مقام ملنا چاہیے۔ اس کو بھی ایک بھرپور زندگی گزارنے کا حق ہے۔ اس کو ستی کی صورت میں مرنے یا پھر معاشرے اور افرادِ معاشرہ کے ہاتھوں ایک اذیت ناک اور ذلیل زندگی گزارنے پر مجبور نہ کیا جائے۔ اسی تصور کا پرچار کرنے کے لیے بیدی اس افسانے میں ایک مقام پر لکھتے ہیں:

> ''میں اپنی بہو کے اس طرح کھل کر ہنسنے پر دل ہی دل میں بہت خوش ہوا۔ مایا بیوہ تھی اور سماج اسے اچھے کپڑے پہننے اور خوشی کی بات میں حصہ لینے سے بھی روکتی تھی۔ میں نے بارہا مایا کو اچھے کپڑے پہننے، ہنسنے کھیلنے کی تلقین کرتے ہوئے سماج کی پرواہ نہ کرنے کا کہا تھا۔ مگر مایا نے از خود اپنے آپ کو سماج کے روح فرسا احکام کے تابع کر لیا تھا۔ اس نے اپنے تمام اچھے کپڑے اور زیورات کی پٹاری ایک صندوق میں مقفل کر کے چابی ایک جوہڑ میں پھینک دی۔''[۳]

مندرجہ بالا اقتباس کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو راجندر سنگھ بیدی نے معاشرے کی اس منفی سوچ کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا ہے اور افراد معاشرہ پر ایسے رسوم کے اثرات کو بھی ظاہر کیا ہے۔ کہ اس طرح معاشرے میں نفرتوں، کدورتوں، بے چینی اور بد دلی کا راج ہو جاتا ہے۔ اسی

افسانے میں معاشرے کے ایک اور رسم ''راکھی بندھن'' کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ معاشرے پر اس کے مثبت اثرات کو عیاں کرتا ہے کہ ہندوستانی سماج میں برسوں سے چلی آئی رسم کو پورا کرنے کی خاطر مایا کا بھائی راکھی بندھوانے خود مایا کے پاس اس کے گھر آتا ہے تا کہ مایا کو ہرگز محسوس نہ ہو کہ اس کا سہاگ لٹ چکا ہے اور اب اس کی وہ حیثیت نہیں رہی بلکہ مایا کا مان اس کے رشتوں کی طرف سے برقرار اور قائم و دائم رہے۔ دوسری طرف بیدی کردار کی زبانی مصلحِ قوم بننے کی کوشش بھی نہیں کرتا کہ مایا کے تمام اچھے کپڑوں اور زیورات کو ایک صندوق میں بند کرکے، تالا لگا کر اس کی چابی کو جوہڑ میں پھینکنے کی بجائے اسے کسی دوسرے ایسے فرد کو دینے کی بات بھی نہیں کرتا جو ان چیزوں کو استعمال میں لاسکے اور معاشرے کا بھلا ہو، بلکہ وہ جو کچھ دیکھتا ہے بعینہٖ انہی کو اپنی تخلیقات کا موضوع بناتا ہے۔ پھر بیدی کے کرداروں کی جو تصویر ابھرتی ہے وہ اس معاشرے میں جگہ جگہ، ہر محلے اور گھر میں موجود افراد کی تصویر ہے۔ وہ اس تصویر کا ناقد نہیں ہے بلکہ اس تصویر کے پردے میں رہنے والے اس موقلم کا ناقد ہے جو اس تصویر میں رنگ بھرتا ہے یعنی معاشرے کے رسوم و روج اور اقدار و روایات کا موقلم، جو انسانوں کی مجبوری و بے بسی کے رنگ ان کی تصویروں میں بھرتا رہتا ہے اور خود پس منظر میں رہ کر ان بے بس و مجبور انسانوں کا مضحکہ اڑاتا رہتا ہے۔ اسی طرح افسانہ ''گرم کوٹ'' میں بھی بیدی نے جہاں نچلے اور درمیانی طبقے کے ایک نمائندہ کنبے کی محرومیوں اور آزردگیوں کی کیچڑ میں لت پت ارمانوں کا موثر نقشہ کھینچا ہے۔ وہیں پر کلرک کی بیوی ''شمی'' کی شکل میں عورت کی طاقت اور مامتا کی قوت کی بھی نشاندہی کی ہے۔ خالص ہندوانہ پس منظر رکھتے ہوئے بیدی کے افسانوں کی تانیثی کردار کی صورت میں جو عورت نظر آتی ہے وہ ایک خالص ہندوستانی عورت ہے۔ یہ عورت بھرپور توانا اور مرکزی کردار کی حامل ہے۔ اپنے اسی توانا اور مرکزی کردار کے باوجود معاشرہ اس کے وجود کو کھلے دل سے تسلیم نہیں کرتا اور اس کو پدرسری معاشرے میں ثانوی حیثیت کی مالک تصور کیا جاتا ہے۔ اسی ثانوی حیثیت کی حامل عورت کا اگر غور کی نظر سے جائزہ لیا جائے اور اس کے ساتھ انصاف پسندی کا رویہ برتا جائے تو محسوس ہوگا کہ عورت کے بغیر کسی بھی معاشرے کی ترقی و بہبود تو کیا کہ اس کے وجود کا تصور بھی ناممکن ہے۔ عورت جس کو ناقص العقل اور کمزور سمجھا جاتا ہے اور اس عورت کی رائے تو کیا کہ اس کے وجود کو بھی معاشرے کے اساسی اصولوں اور رسوم و رواج میں قابل تعرض نہیں سمجھا جاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں عورت ہمیشہ ایک پسے ہوئے طبقے اور اس کی افراد کی نمائندہ کی شکل میں نظر آتی ہے، لہٰذا

بیدی اس پسے ہوئے طبقے جو کہ اپنی کوئی آواز کہیں نہیں پہنچا سکتا، کی آواز بن کر ابھرتے ہیں اور اس کے افسانوں میں بڑے اور مرکزی کردار عورت ہی کے نظر آتے ہیں۔

بقول ڈاکٹر عصمت جمیل:

> ''بیدی اُردو کے واحد افسانہ نگار ہیں جنہوں نے عورت کے اس مکمل وجود کو از سر نو بحال کرنے کی کوشش کی جو جدید معاشرے کے باطنی زوال کی بنیاد پر ٹکڑے ٹکڑے ہوا اور افراد معاشرہ کی بصارت و بصیرت پر چھا جانے والی مادی گرد و غبار کے باعث بہت بڑی حد تک فراموش کر دیا گیا۔''(۴)

عورت معاشرے کا نصف ہے اور بے کار و لایعنی نصف نہیں بلکہ لازمی اور کارآمد نصف، اس نصف کے بغیر معاشرے کی تکمیل کا خواب کبھی بھی شر مندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ یہ نصف فطرتاً نرم و نازک ہے جو معاشرے میں نرمی، گھلاوٹ، محبت اور ٹھنڈک کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ بیدی کے افسانے عورت کے ان نرم و نازک احساسات کی کہانیاں ہیں جو معاشرے میں امن و امان اور سکون و قرار کا باعث ہیں۔ مثلاً ان کے افسانے ''اپنے دکھ مجھے دے دو'' کی کردار ''اندو'' ایک مکمل ہندوستانی بیوی ہے۔ جسے معلوم ہے کہ بیوی بننے کے ساتھ ہی اس ذمہ داریوں میں بے حد اضافہ ہو جاتا ہے۔ جبکہ مرد کا عورت سے رشتہ صرف جسم کا رشتہ ہی رہتا ہے۔ عورت جسم کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ اندو شادی کی پہلی رات ہی اپنے شوہر سے اس کے دکھ لے لیتی ہے اور پھر ان دکھوں کے بدلے اس کے لیے ایسی طاقت ثابت ہوتی ہے جو ہر دکھ کو سکھ میں بدل دیتی ہے۔ اسی طرح ''لاجونتی'' میں بھی عورت کے نازک ترین احساسات کی نمائندگی ملتی ہے۔ بنیادی مسئلہ شوہر کی طرف سے عدم تفہیم کا ہے۔ فسادات کے ہنگامے میں جب دوسری بہت سی عورتوں کی طرح لاجونتی بھی اغوا ہو جاتی ہے تو سندر لال کو دھچکا سا لگتا ہے۔ افسانے میں رام سیتا، دھوبی کا طعنہ اور لاجونتی کے دوبارہ بسانے پر لوگوں کے طعنے اور بکتی ہوئی عورتوں کے مناظر اس افسانے کو اس لحاظ سے فکر انگیز بناتے ہیں کہ عورت ہمیشہ مردوں کے ہاتھوں لٹتی ہے مگر طعنہ ہمیشہ ہی عورت کو سننا پڑتا ہے۔ اس کے باوجود عورت معاشرے کے قیام اور مرد کا بھرم رکھنے کے لیے سب کچھ خاموشی سے برداشت کر لیتی ہے۔ سندر لال اس کی بازیابی کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے اور جب لاجونتی واپس مل جاتی ہے تو احساسِ ندامت سے اسے دیوی کا درجہ دیتا ہے۔ مگر وہ یہ نہیں جانتا کہ عورت دیوی نہیں رفیقہ بن کر رہنا چاہتی ہے مثلاً:

"سندر لال، اب لاجونتی کو لاجو کے نام سے نہیں پکارتا تھا۔ وہ اسے کہتا تھا" دیوی! وہ کتنا چاہتی تھی کہ سندر لال کو اپنی واردات سنائے اور سناتے سناتے اس قدر روئے کہ اس کے تمام گناہ دھل جائیں لیکن سندر لال لاجو کی باتیں سننے سے گریز کرتا تھا۔۔۔ جانے دو بیتی باتیں۔ اس میں تمہارا کیا قصور ہے؟ قصور تو ہمارے سماج کا ہے جو تجھ ایسی دیویوں کو اپنے ہاں عزت نہیں دیتا۔"(۵)

لاجونتی کے اس ذہنی و جذباتی بحران کا تجزیہ کرنے سے اس کا وہ مخصوص تمدنی مزاج سامنے آتا ہے کہ جو مرد کی حاکمیت اور بالادستی کا عادی ہے۔ وہ ایسا تمدنی اثر ہے جو نہ تو اغوا ہونے سے پہلے اور نہ بعد میں سندر لال کو لاجونتی کے احساسات جاننے دیتا ہے۔ مگر لاجونتی اغوا ہونے سے قبل والے سلوک کی عادی اور خواہشمند ہے جب سندر لال اسے مارتا بھی تھا اور محبت بھی کرتا تھا۔ سندر لال کا وہ رویہ روایتی ہندوستانی شوہر کا رویہ تھا۔ لیکن اب لاجونتی کو ایک دیوی کے روپ دینے سے وہ کیا محسوس کرتی ہے اس کی اسے خبر تک نہیں ہوتی اور نہ ہی وہ اس کا احساس کر سکتا ہے۔ بیدی کردار سازی کے عمل میں معاشرتی و تہذیبی عوامل کو پس پشت نہیں ڈالتے ہیں۔ وہ اپنے افسانے "گرہن" میں عورت کی ازلی و ابدی اہانت کو پیش کیا ہے۔ افسانے کی ہیروئن "ہولی" کھاتے پیتے گھرانے کی لڑکی ہے لیکن شوہر کا گھر بھی اس کے لئے جائے امان نہیں ہے اور گھر کے باہر بھی اہانت اور موقع پرستی اس کی راہ دیکھ رہے ہوتے ہیں اور اس کے لیے اگر کوئی راستہ کھلا ملتا ہے تو وہ صرف اور صرف موت کا راستہ ہے۔

راجندر سنگھ بیدی نے ہندوستانی معاشرے میں صدیوں سے رائج رسومات پر بھی تنقید کی ہے مثلاً 'چھوکری کی لوٹ' میں بیوہ کی دوسری شادی کا سوال اٹھایا گیا ہے۔ افسانہ 'من کی من میں' افسانہ میں انہوں نے ہندو معاشرہ میں بیوہ کے ساتھ ہونے والے سلوک پر تنقید ہے۔ اس افسانے میں مرکزی کردار ترقی پسند اور انسان دوست سوچ کا اظہار کرتا ہے یا اپنے دور کی مقبول آئیڈیلزم کو منکشف کرتا ہے جب وہ موت کی دہلیز پر کھڑے یہ کہتا ہے:

"کسی بہن بھائی کو دکھی دیکھ کر مجھ سے مدن اور رتی کے سہیلے نہ گائے جاتے ہیں، گائے جائیں گے۔"(۶)

اسی طرح افسانے میں ایک مقام پر سماجی حالات کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"تمام عورتیں ہنستی کھیلتی رہیں۔ پھر اوٹی بھرن کیا گیا۔ سہاگنوں نے ایک دوسرے کی مانگ میں سندور لگایا۔۔۔ امبو بھی وہیں پاس کھڑی رہی۔ سہاگن کے پاس بیوہ

کھڑی رہے۔ رام رام!۔۔۔ کارنی نے امبو کو بازو سے پکڑ کر بر آمدے سے باہر زور کا دھکا دیا۔ اور بولی۔۔۔ دیکھتی نہیں کیا ہو رہا ہے؟"(۷)

نہ صرف یہ کہ سماجی اور معاشرتی اقدار ورسوم میں اونچ نیچ اور تفریق کا عمل جاری رہتا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ مذہبی رسوم وعقائد میں بھی یہی تفریق کا عمل کارفرما نظر آتا ہے۔ تبھی تو ایک بیوہ بے چاری کو پوجا میں شریک ہونے کا حق بھی حاصل نہیں اور باقی عورتوں کی بیچ میں سے اس کو دھکا دے کر نکال دیا جاتا ہے کہ تمہارا وجود اس جگہ بھی ناگوار ہے۔ یہ معاشرتی ناانصافی کی وہ انتہا ہے جس کا مداوا مذہب کے ہاتھ میں بھی نہیں اور بیدی اپنے کردار امبو کی صورت میں اس ناانصافی پر نوحہ کناں ہے۔

راجندر سنگھ بیدی نے معاشرے میں رائج رسموں اور ان کی ادائیگی میں انسانی جذبات کے استحصال پر نہ صرف طنز کیا ہے بلکہ سوال بھی اٹھایا ہے۔ بیدی کا افسانہ 'کوکھ جلی' ہندوستانی معاشرے کا بہترین عکاس ہے۔ اسی طرح ہندوستانی معاشرتی کی ایک تصویر اس کے افسانے 'لمبی لڑکی' میں سے بھی جھلکتی نظر آتی ہے جس میں بوڑھی عورت اس وقت تک نہیں مرتی جب تک اپنی پوتی کی شادی ہوتے نہیں دیکھ لیتی کیوں کہ عورت اپنی اولاد کی تکمیل چاہتی ہے۔ لیکن دوسری طرف دیکھیں تو اس کا ہاتھ مانگنے جب لوگ آتے ہیں تو یہی دادی اس کے سر پر ہاتھ رکھتی ہے اور کہتی ہے کہ بیٹھی رہو اٹھنا مت کیونکہ "منی سوہی" بن ماں کی ایسی بچی ہے جس کے پانچ فٹ آٹھ انچ قد نے ٹھنگنی دنیا کے ردعمل کا اندیشہ پیدا کر رکھا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کے لمبے قد کو دیکھ کر ٹھنگنی دنیا اس کے رشتے سے انکار ہی نہ کر دے اور یہ بے چاری ساری زندگی بن بیاہی ہی رہے۔

بیدی کے فکشن میں عورت کی اپنے بیٹے کے لئے محبت خاص طور پر دکھائی گئی ہے۔ اس کی وجہ بھی یہ ہے کہ اس معاشرے میں عورت کو ہمیشہ ہی کمزور تصور کیا گیا ہے اور اس کو ہمیشہ کسی سہارے کی ضرورت رہتی ہے اس تناظر میں دیکھیں تو شوہر کے بعد اگر کوئی مرد عورت کو مالی، جسمانی اور عزت و آبرو کا تحفظ دے سکتا ہے تو اس کا بیٹا ہی ہے۔ اس لیے بیدی کے افسانوں "دس منٹ کی بارش میں" کی راٹا "بھولا" کی مایا اور "گھمنڈی" کی ماں تینوں بیٹوں کی ماں ہونے پر فخر کرتی ہیں کیوں کہ اس طرح وہ محفوظ اور باعزت ہیں لیکن یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ معاشرہ عورت کو آزاد فرد کی حیثیت سے رہنے کیوں نہیں دیتا؟ اسے حوالوں کی ضرورت کیوں ہے؟ یہ سوال ابھر کر عورت کی بے بسی کے تصور کو گہرا کرتے ہیں۔ صرف یہ نہیں بلکہ معاشرے میں

روزانہ کی بنیاد پر پیش آمدہ بیسیوں سینکڑوں ایسے حالات و واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں جن کے بارے میں ہر قلبِ سلیم میں بے شمار سوالات اٹھتے رہتے ہیں۔ اور ان سوالات کے جوابات کسی کے پاس بھی نہیں ہوتے کیونکہ انسان معاشرے کے رسوم ورواج کا قیدی ہے۔ وہ معاشرے کے رسوم ورواج اور اقدار اور روایات کا پابند ہے۔ بہت دفعہ اگر سوال پیدا ہوتے بھی ہیں تو ان کا حل کیا کہ ان کے اظہار سے بھی معاشرے سے بغاوت تصور ابھرتا ہے۔ اس لیے اکثر ایسے سوالات یا تو سر اٹھاتے ہی دبائے جاتے ہیں اور اگر ان کا اظہار کر بھی لیا جائے تو فضول و بے سود۔ لیکن جو درد مند دل اور زیرک مشاہدہ رکھنے والے ہیں وہ ان سوالات کو دباتے نہیں بلکہ معاشرے کے منہ پر طمانچے کی صورت جڑ دیتے ہیں۔ بیدی نے بھی اپنے افسانوں میں معاشرے کے ان رسوم ورواج اور اقدار و روایات پر سوالات ابھارے ہیں جن سے معاشرے کی اصل تصویر قاری کے سامنے آجاتی ہے۔ بقول ڈاکٹر انوار احمد:

> ''بیدی نے بارہا اپنی کہانیوں میں سادہ دل لوگوں کے عقائد میں جھانک کر غالب کی طرح بعض سوالوں کے نقش ونگار ان کے گرد ایسے حاشیے کی صورت آویزاں کئے ہیں کہ ایک انسان دوست فنکار کے دین دھرم کے بنیادی خطوط نمایاں ہو جاتے ہیں۔''(۸)

معاشرے کے اصول ہر فرد پر مختلف انداز سے اثر ڈالتے رہتے ہیں۔ اسی بوقلمونی کی ایک مثال کے طور پر بیدی نے ''غلامی'' ایک ایسا افسانہ تخلیق کیا ہے جس میں ریٹائرڈ شخص کی نفسیات کو بھرپور طریقے سے پیش کیا ہے۔ بے شک اس کا گردوپیش بھی بے رحمانہ ہے، مگر اس کے لئے یہ احساس ہی جان لیوا ہے کہ جسے اس نے ۳۳برس خون پلایا، وہ مشین اس کے بغیر بھی چل سکتی ہے۔ اور پھر اس افسانے کے اختتام پر ایسی صورت حال سامنے آتی ہے کہ ہم نہ تو کھل کر مسکرا سکتے ہیں اور نہ ہی رقت قلب کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔ اسی طرح ''رحمان کے جوتے'' بھی ایک بے حد موثر افسانہ ہے۔ ہماری معاشرت کے سادہ دل، کمزور اور بوڑھے جب پولیس سے پٹ پٹا کر منزلیں کھوٹی کرتے ہیں، تو ان کی معصوم سوغاتیں بھی لہو میں تر ہو جاتی ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ ان کی چھوٹی چھوٹی تمناؤں کا خون ہو جاتا ہے جس کا احساس معاشرے میں بہت کم لوگوں کو ہی ہو سکتا ہے۔ ورنہ تو اکثر لوگ کنی کترا کر گزر جاتے ہیں۔ اس صورتِ حال کا اظہار بیدی اس انداز سے کرتے ہیں:

”گنڈیرے کی لٹھ جسم سے علیحدہ خون میں بھیگی ہوئی ایک طرف پڑی تھی اور مکی کے بھٹے کھلی ہوئی چادر سے نکل کر فرش پر لڑھک رہے تھے۔“(۹)

دیگر افسانوں کی طرح ”زین العابدین“ بیدی کا ایسا افسانہ ہے جس میں افسانے کے مرکزی کردار کے بگاڑ اور معاشرتی بے راہ روی کے ذمہ دار سماجی حالات ہیں۔ چنانچہ ہر انسان دوست فنکار کی طرح بیدی نے اس کردار کو قابل نفرت نہیں قابل رحم بنایا ہے۔ اسی وجہ سے زین العابدین کے افسانے کے آخری حصے میں چہار سو سنائی دینے والی چیخ و پکار کی گونج افسانے کے اختتام کے بعد بھی سنائی دیتی ہے۔ اور قاری کو ایک بے چینی کی حالت میں چھوڑ کر معاشرے کی خامیوں اور کمزوریوں پر سوچنے کی دعوت دیتی ہے۔ بیدی نے کرداروں کی نفسیات اور ذہنی اور جذباتی کیفیتوں کا مطالعہ کر کے کرداروں کے سماجی و تہذیبی رویوں کا تجزیہ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس کے افسانے ”حجام الہ آباد“ کا کردار ”لوک پتی“ جو ایک حجام ہے، اس کی بے پناہ مصروفیتوں کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس کی دُکان الہ آباد کے سنگم کے کنارے ہے۔ ہندوؤں کے اس مقدس تیرتھ استھان پر معتقدین کی ایک بھیڑ جمع رہتی ہے۔ مذہبی روایت کے مطابق اس سنگم پر بال کٹوانا مقدس فریضہ ہے۔ اور حجام لوگوں کے مذہبی عقائد کو ان کی کمزوری سمجھ کر فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ سب لوگ اپنی اپنی باری کے لئے چلائے جاتے ہیں اور اسے بہت اچھی طرح معلوم ہے کہ سب بال اس کے پاس سے ہی کٹوائیں گے کیونکہ مذہب کی پاسداری لازمی ہے، اس لئے وہ مطمئن نظر آتا ہے۔ لوگوں کی چیخ و پکار کا اس پر اثر نہیں ہوتا، بالکل ایسے ہی جیسے عام لوگ ہمارے ملک میں اختیارات، بنیادی ضروریات زندگی، یہاں تک کہ اپنی جان کی حفاظت تک کے لئے آواز بلند کرتے ہیں اور چیخ چیخ کر ارباب اختیار کو خواب خرگوش سے جگانے کی کوششیں کرتے رہتے ہیں، لیکن سب ناکام، بعینہ یہی حالات اس افسانے میں نظر آتے ہیں کہ جو بااختیار ہے وہ آرام اور مزے میں ہے اور جو ضرورت مند ہیں وہ اپنی معمولی سی ضرورت کے لیے چیخ و پکار پر مجبور ہیں۔

کسی بھی ترقی یافتہ سماج کا ایک تمدنی ڈھانچہ ہوتا ہے اور بیدی کی تخلیقات میں معاصر معاشرت و تمدن کی عکاسی بھرپور انداز میں دکھائی دیتی ہے۔ بیدی کا تعلق کیونکہ پنجاب سے تھا اس لئے ان کے فکشن میں پنجابی معاشرے کی جھلک بہت بھرپور انداز میں ملتی ہے۔ خصوصاً ان کا ناولٹ ”ایک چادر میلی سی“ پنجاب کے پسماندہ دیہی معاشرے کی جس قدر صحیح اور حقیقی تصویر پیش

کرتا ہے، اس کو مد نظر رکھتے ہوئے بیدی کے سماجی شعور کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ ان کے تقریباً سبھی کردار وہ افراد ہیں جو ہندوستان کے معاشرے کے متوسط طبقے سے متعلق ہیں۔ بقول وارث علوی:

> ''بیدی کے افسانوں میں ہندوستان کی روح جاگتی ہے۔ ان کے افسانوں میں اس دھرتی کی بو باس بسی ہوئی ہے۔ اس زمین کے رسم رواج، عقائد و توہمات سے افسانوں کو رنگ و آہنگ ملتا ہے۔ بیدی کی کوئی کہانی مستعار معلوم نہیں ہوتی۔ کسی کہانی کی تہذیبی فضا مصنوعی معلوم نہیں ہوتی۔''(۱۰)

وارث علوی کی رائے سے یہ پتا چلتا ہے کہ بیدی کے افسانوں کے تہذیبی و تمدنی تجزیے سے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں پائے جانے والے رسم و رواج، عقائد، توہمات اور مذہبی روایات کا مطالعہ ناگزیر ہو جاتا ہے اور اس معاشرے کی روح اور اصل چہرہ سامنے آجاتا ہے۔ دراصل ہندوستانی تہذیب، تمدن اور گھریلو، دیہاتی، قصباتی اور شہری سماج کے اظہار پر بیدی کو جو قدرت حاصل ہے اور خاص طور پر پنجاب کے دیہی و قصباتی معاشرے کی تہذیب سے جس قدر واقفیت وہ رکھتے ہیں وہ ان کے ہم عصر قلمکاروں کو میسر نہیں ہے۔ ''ایک چادر میلی سی'' میں ہندوستان کے دیہاتی سماج میں رہنے والے ایک مجبور اور بے بس عورت کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ جس میں ''رانو'' کو اپنی اولاد بچانے کے لئے مختلف پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بھوک و افلاس مٹانے کے لئے رانو اپنے دیور کی بیوی بن جاتی ہے۔ بالخصوص دیہاتی سماج میں اپنی عزت و ناموس بچانے کے لئے اپنے دیور کی چادر کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ رانو اور منگل اپنے رشتے سے مطمئن نہیں ہوتے لیکن مجبوری کی وجہ سے اس رشتے میں جڑنا پڑتا ہے۔ اس طرح رانو گاؤں میں موجود انسانی روپ میں چھپے درندوں سے اپنی بیٹی کو بچانے کے لئے اپنے جذبات کی قربانی دے دیتی ہے۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''بیدی صاحب کی ایک اہم تحریر ''ایک چادر میلی سی'' جو نقادوں کی بے توجہی کی بنا پر اکثر ناولٹ ہی کی حیثیت سے کتابی صورت میں آتی رہی ہے۔ دراصل ایک خاص عہد اور علاقے کی مخصوص اجتماعی نفسیات، علامتی رموز، پیچیدہ معاشرتی مسائل اور چھوٹے کینوس پر حیات و ممات کے فکری منظر نامے کے حوالے سے ناول ہی ہے۔۔۔''(۱۱)

اگر ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کی رائے کا اگر غور سے جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ ناولٹ جو ایک شادی کی کہانی ہے۔ دراصل معاشرتی جبر، رسوم و رواج کی پاسداری اور ان کو

قائم و دائم رکھنے کا سماجی داستان ہے۔ یہ در حقیقت اس سماج کا بھی قصہ ہے جہاں ہوسناک اور شر پسند لوگ بستے ہیں اور افرادِ معاشرہ کو اپنے طور اطوار سے چلانا اپنا حق سمجھتے ہیں ۔ اور اس طرح معاشرے کے بے بس اور مجبور و لاچار افراد کی مجبوری و لاچاری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی شر پسندی اور ہوسناکی کے جذبات کی تسکین کا سامان پیدا کرتے رہتے ہیں۔ اگر معاشرے میں بے بس اور مجبور افراد نہ رہے تو ان لوگوں کی ہوسناکی اور شر پسندی و برائی کے جذبات کی تسکین کا کوئی سامان بہم نہ ہوسکے۔ اس لیے نہ صرف ان لوگوں سے اپنے خاطر خواہ فوائد حاصل کرنے کے درپے ہوتے ہیں، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان کی حالت کو اُسی طرح سقیم رکھنے کے جتن بھی کرتے رہتے ہیں تاکہ وہ مجبور و بے بس رہیں اور ان کا کام چلتا رہے۔ اس افسانے کے ذریعے بیدی نے درپردہ انہی لوگوں کی چالبازی، مکر و فریب اور اصلیت سے قارئین کو روشناس کرانے کی کوشش کی ہے۔ محمد توصیف لکھتے ہیں:

> ''بیدی کی کہانیوں میں جنس اور حقیقت کے لوازمات بنیادی عنصر تھے۔ بیدی منٹو کی طرح برہنگی اختیار نہیں کرتے بلکہ سماجی ناانصافیوں، محرومیوں اور ظلم و ستم کے پسِ پشت جذبوں کو منظرِ عام پر لاتے ہیں۔''(۱۲)

اسی سوچ اور نظریے کے حامل بیدی نے اپنی تحریروں کے متعلق ایک مقام پر خود بھی کچھ اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے:

> ''مجھے کچھ کہنا تھا معاشرے کے بارے میں، زمانے کے بارے میں، حالات کے بارے میں، خود اپنے بارے میں۔ میں نے سوچا تھا کہ اپنی تصانیف کے ذریعے معاشرے کے زخموں کو دکھاؤں، تاکہ جو لوگ ان پر مرہم لگاسکتے ہیں لگائیں، یا ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا بیان کروں جو بڑی بڑی مصیبتیں بن جاتی ہیں۔''(۱۳)

انکی یہی سوچ ان کے پورے فکشن میں ابھرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ان کا فکشن انسانی زندگی کا عکاس ہے اور وہ صرف زندگی کی خوشنما اور بدنما تصویر ہی نہیں دیکھتا بلکہ اس کی گہرائی میں جا کر اس کے پس پشت ان ذہنی خد و خال کو بھی دیکھتا ہے جو کہیں او جھل ہی رہتے ہیں۔ افسانہ نگار کی یہ فکری صلاحیت مقصدیت کو جنم دیتی ہے اور اگرچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بیدی مقصدیت کے بلند بانگ دعوے نہیں کرتا۔ وہ صرف اتنا ہی کہتا ہے کہ معاشرہ کی جو تصویر اسے نظر آتی ہے اسے لوگوں کے سامنے لانا چاہتا ہے لیکن اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو اس کی تخلیقات میں سماج اور معاشرے

کے چہرے پر جو بد نما اور گھناؤنے داغ نمودار ہوتے ہیں ان کی نشان دہی ہی اس کی مقصدیت کی حامل سوچ کی عکاس ہے۔ جب کوئی چیز نظر سے او جھل ہی رہے تو اس کی خوبی یا خامی کا تصور ابھرنا کہاں ممکن ہے ہاں جب اس او جھل چیز کو آنکھوں کے سامنے کر دیا جاتا ہے تو دیکھنے والے کی آنکھیں پھر اس چیز کی خوبیوں اور اس کی خامیوں کو پرکھ لیتی ہیں۔ بیدی کا کام معاشرے کی ان او جھل تصویروں کو سامنے لانا ہے جو پس منظر میں رہتے ہوئے پیش منظر میں لوگوں کی زندگیوں کو جہنم زار بنانے میں مگن رہتی ہیں اور جب یہ تصویریں سامنے آجاتی ہیں تو ان کے گمراہ کن اور اذیت ناک اثرات کا مداوا کرنے کی سوچ بھی ابھر سکتی ہے۔ بیدی نے معاشرتی رسوم و رواج اور اقدار و روایات کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے سماجی ماحول کی عکاسی اور سماں بندی نہایت دلچسپ پیرائے میں کی ہے جس سے معاشرے کی ایک مکمل تصویر اس کی تمام تر خامیوں اور خوبیوں کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔ یہ تصویر قارئین کے لیے تجسس کا سامان بھی رکھتی ہے اور ان کو سوچ بچار پر مجبور بھی کرتی رہتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ انوار احمد،ڈاکٹر،اردو افسانہ،ایک صدی کا قصہ،مثال پبلشرز،فیصل آباد، ۲۰۱۰،ص ۳۸۳

۲۔ امیر خسرو، نقل کردہ خوشحال خان خٹک، دستار نامہ ترجمہ و توضیح،ڈاکٹر نقیب احمد جان/منزہ مبین،ویمن یونیورسٹی صوابی،ص ۱۹۸

۳۔ راجندر سنگھ بیدی، دانہ و دام،نیا ادارہ،لاہور،۱۹۴۳،ص ۱۰

۴۔ عصمت جمیل،ڈاکٹر،نسائی شعور کی تاریخ،مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد،۲۰۱۲،ص ۱۷۵

۵۔ راجندر سنگھ بیدی،اپنے دکھ مجھے دے دو،مکتبہ جامعہ دہلی،۱۹۹۷،ص ۲۰،۱۹

۶۔ راجندر سنگھ بیدی، دانہ و دام،نیا ادارہ،لاہور،۱۹۴۳،ص ۴۴

۷۔ ایضا،ص ۴۸

۸۔ انوار احمد،ڈاکٹر،اردو افسانہ۔ایک صدی کا قصہ،مثال پبلشرز،فیصل آباد،۲۰۱۰،ص ۳۹۰

۹۔ راجندر سنگھ بیدی، دانہ و دام،نیا ادارہ،لاہور،۱۹۴۳،ص ۳۵

۱۰۔ وارث علوی،راجندر سنگھ بیدی،ساہتیہ اکادمی،دہلی،،۱۹۸۹ص ۵۹

۱۱۔ ممتاز احمد خاں،ڈاکٹر،اردو ناول کے بدلتے زاویے،ویلکم بک پورٹ، کراچی،۱۹۹۳،ص ۱۱۴

۱۲۔ محمد توصیف ، راجندر سنگھ بیدی اور ایک چادر میلی سی، مشمولہ؛ اردو ریسرچ جرنل، جنوری۔جون ۲۰۱۷ء،ص ۶۲

۱۳۔ وارث علوی،راجندر سنگھ بیدی،ساہتیہ اکادمی،دہلی،،۱۹۸۹ص ۴۲۲